

دلی دوا

مصنف

سید ضمیر حسن دہلوی



اردو اکادمی، دہلی

فون: ۲۷۶۲۱۱

دلی والے

مصنف

سید ضمیر حسن دہلوی



اردو اکادمی، دہلی

فون: ۲۷۶۲۱۱

مشاورتی کمیٹی

کنور مہندر سنگھ بیدی ستمبر (چیئرمین پروگرام کمیٹی)
پروفیسر خواجہ احمد فاروقی
ڈاکٹر کامل قریشی
بیگم ذکیہ سلطانیہ نیئر
جناب رحمت نیئر
جناب مدن لال دھون
مرغوب عابدی
سیّد شریف الحسن نقوی (مشیر)

مصنف: سیّد ضمیر حسن دہلوی
سن اشاعت: مارچ ۱۹۸۶ء
بہائمتمام: محمد عارفین، ڈپٹی سکریٹری
معاون: ڈاکٹر انتظار مرزا
طباعت: ثمر آفسیٹ پرنٹرز دہلی

پیش لفظ

دہلی اور اُردو ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ چنانچہ دہلی کے اُردو داں طبقہ کی خواہشوں، اُمنگوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے پیش نظر ۱۹۸۱ء میں ملک کی ہر دل عزیز وزیر اعظم آں جہانی محترمہ اندرا گاندھی کے ایما پر اُردو اکادمی، دہلی کا قیام عمل میں آیا، جس پر نہ صرف اُردو خواں بلکہ تمام جمہوریت پسند حلقوں کی طرف سے اظہارِ مسرت و اطمینان کیا گیا۔

اُردو اکادمی، دہلی کا ایک باضابطہ آئین مرتب ہوا جس کی رو سے دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر اس کے مستقل صدر مقرر ہوئے۔ اراکین کو دو سال کے لئے نامزد کیا گیا۔ اکادمی کی سرگرمیوں کو رو بہ عمل لانے کے لئے تین ذیلی کمیٹیوں کی تشکیل دی گئی۔

۱۔ پروگرام کمیٹی

۲۔ ایوارڈ کمیٹی

۳۔ تعلیمی کمیٹی

ان کمیٹیوں کے کنونیٹر اور رکن نامزد اراکین ہی میں سے مقرر کئے جاتے

ہیں۔ یہ کمیٹیاں اپنے اپنے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اکادمی کی سرگرمیوں کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ یہ سرگرمیاں مختلف النوع اور بوقلموں ہیں۔ ان میں سماجی ثقافتی اور وسیع تر تہذیبی و علمی کارکردگی سے لے کر مقبول عوامی تفریحی پروگراموں تک کا تناظر بھی رہا ہے۔

علمی سرگرمیوں کا ایک نمایاں پہلو سیمینار / ورکشاپ منعقد کرنا ہے۔ ان سیمینار / ورکشاپ کے موضوع سے متعلق پس منظر کے طور پر حاضرین کے لئے کتابچوں کی اشاعت بھی ہے۔ زیر نظر کتابچہ پروگرام کمیٹی کے تحت ہونے والے سیمینار ”دلی والے“ منعقدہ ۲۹۔۳۰۔۳۱ مارچ ۱۹۸۶ء سے متعلق ہے جس کے مصنف جناب سید ضحیر حسن دہلوی ہیں ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اکادمی کی درخواست پر کتابچہ تحریر فرمایا۔ اس کتابچہ میں قدیم دلی والوں کے کمالات، عادات و اطوار، رہن سہن، بولی ٹھولی، سیر سپاٹا، ٹھٹھا اور طور طریقوں کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کی گئی ہے تاکہ حاضرین محفل کے سامنے زمانہ قدیم کے دلی والوں کا ایک نقشہ پیش کیا جاسکے۔ اور نئی نسل اس دریچہ سے ماضی کی ایک جھلک دیکھ سکے۔

لیفٹیننٹ گورنر عالی جناب ہرکشن لال کپور کی خدمت میں اظہار تشکر اکادمی اپنا خوشگوار فریضہ سمجھتی ہے جن کی حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کام پائے تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ایکزیکٹو کونسلر (تعلیمات) کی بھی سرپرستی ہمیں ہمیشہ حاصل رہی ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں اور دہلی انتظامیہ کے سکرپٹری (السہ) جناب ہمیش ورما کی کرم فرمائی کے بھی ممنون ہیں۔

سید شریف الحسن نقوی
مشیر اردو اکادمی، دہلی

دہلی
۱۳ مارچ ۱۹۸۶ء

دینی و اَل

دلی والے

موجودہ نسل جس نے اپنے تئیں دین دھرم، تہذیب تمیز، نیکی اور بھل منسانی، سب سے آزاد کر لیا ہے اگلے لوگوں کی شرافت اور نیک نفسی کو بھلا کب تسلیم کرے گی۔ ان کے کان میں تو شیطان نے یہ صورت چھونکا ہے کہ علم، اخلاق، انسانیت اور غیرت جیسی ان میں پائی جاتی ہے ویسی نہ کبھی تھی اور نہ آئندہ ہوگی۔ بس یہی خوش فہمی ہے جس کے باعث آج کے دور کا ہر شخص افلاطون اور افراسیاب بنا پھرتا ہے۔ جسے دیکھتے بغلیں کھولے، مگر دن اکڑائے فوں فوں کرتا رعونت سے زمین روندتا ہے اللہ اللہ کسی کو اپنے آگے گردانتا ہی نہیں۔ جدید فلسفیوں اور سائنسدانوں کو، اللہ معاف کرے، اپنا خدا بنایا ہے کہ ان کی بات سے سیر مو اختلاف نہیں ہو سکتا۔ ہاں باپ دادا، بزرگوں، پیر فقیر اور پیغمبروں پر جتنے چاہو اعتراض کرالو۔ ان کی نظر میں اگلے لوگ سفاک، جاہل، کم کوش، بد عقیدہ، اوہام پرست اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ اپنے منہ میاں مٹھو جنتے ہیں۔ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ جو میرے ہے سو راجا کے نہیں۔ اب آپ ہی بتائیے ایسے حالات میں اگر میں قدیم دلی والوں کی نیک خصلتی، علم دوستی اور وضع داریوں کا رونا رونے لگوں تو کون سننے کو روادار ہوگا۔ پھر یہ کہ وہ سب دلی والے جو خاک نشینی میں کج کلاہی اور فقری میں شاہی کیا کرتے تھے، یا تو اللہ کو پیارے ہوئے یا بٹوارے کی افراتفری میں دیس چھوڑ بدیس جا بسے غرض یہ کہ اب دلی والوں کی خوبیاں درگور اور در کتاب ہیں جس کے

دیدے روشن ہیں وہ دیکھتا سمجھتا اور تسلیم کرتا ہے جس کے پھوٹ گئے وہ بھلا کیوں
اُن دیکھی باتوں پر ایمان لانے لگا۔

اس کے علاوہ میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ مجھے آتا جاتا تو کچھ ہے نہیں لکھتا ہوں تو
قلم ساتھ نہیں دیتا، بولتا ہوں تو یوں جیسے طوطا ادوان پر چڑھتا ہے، زبان لڑکھڑاتی
ہے نہ علم و ہنر کچھ حاصل کیا، نہ عالموں اور ہمہ دانوں کی صحبت نصیب ہوئی۔ اس
تہی مائیگی پر اگر زبان کھولوں گا تو آپ ہی نکو بنوں گا۔ اپنی بات منوانی تو درکنار، پوری
طرح کہنے کا بھی مجھے سلیقہ نہیں۔ دلی کے عروج و زوال کی کہانی وہ سناتے تھے
جنہیں بارگاہ ایزدی سے زبان و بیان پر قدرت بخشی گئی تھی۔ میر باقر علی داستان گو
یا مرزا فرحت اللہ بیگ، اللہ بخشے، زندہ ہوتے تو اپنی بات مار مار کے منوالیتے۔ بات یہ
ہے کہ ان کی زبان میں جادو تھا علم و فن انھوں نے ورثے میں پایا تھا اگلے لوگوں کی صحبت
اٹھائی تھی۔ حصولِ کمال کے لئے راتیں کالی کی تھیں، آنکھوں کا نیل نکالا تھا جب
کہیں جا کر یہ مرتبہ انہیں حاصل ہوا تھا مجھ ایسوں کی طرح تھوڑی کہ دس پندرہ سال
کسی تعلیمی ادارے میں جھک مارا، دو چار لفظ انگریزی کے پڑھے، اپنی زبان چھوڑ
ایک سنت بچھڑی زبان اپنائی اور تعلیم یافتہ لوگوں میں شمار کئے جانے لگے۔ آنکھوں
کے اندھے نام نین سُکھ، ایک ڈگری ہے جو کل سرمایہ حیات ہے تنگی کیا نہائے کیا
پنچوڑے، آپ ہی آپ کڑھتا ہوں۔ جب گریبان میں منہ ڈالتا ہوں تو شرم سے گردن
جھکی کی جھکی رہ جاتی ہے، دلی میں پیدا ہوا، دلی میں پلا بڑھا مگر پرانے دلی والوں کی
خوبو کچھ مجھ میں نہیں پائی جاتی۔ مجھ پر تو وہ مثل صادق آتی ہے کہ دلی میں رہے اور بھاڑ
جھونکا۔ اب احساس اپنے جہل کا ہوتا ہے تو اس کا مداوا نہیں کر سکتا۔ عمر عزیز غفلت
میں کاٹ دی۔ اور اگر اس ڈھلتی چھاؤں میں بٹرا بھی اٹھاؤں تو کس کے پاس بیٹھوں،
کس کی بانیں سنوں جو کچھ بصیرت مجھے بھی حاصل ہو۔ انقلابات کی بادِ سموم نے پروانوں

کی خاک تک نہ چھوڑی۔ جو لوگ دہلوی تہذیب کی رستی کو دانتوں سے پکڑے رہے ایک ایک کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے، فلکِ تفرقہ پر واز نے وہ تاک کے پتھر مارا کہ دلی شہر کے آثار تک نیست و نابود کر دئے۔ اب لوگ جسے دلی پکارتے ہیں وہ ایک اُجڑا دیار ہے۔ حویلیاں، چھتے، ڈیوڑھیاں، درو دیوار، طاق اور محرابیں سب دیکھتے دیکھتے دکانوں اور گوداموں کے جنگل میں بدل گئیں جدھر نگاہ اٹھتی ہے پانچ چھ منزلہ مکان بنے دکھائی دیتے ہیں، نیچے بڑی بڑی مارکیٹیں ہیں۔ زمین کھود کر گودام نکال لئے گئے دنیا کی چیزیں ان گوداموں میں بھری رہتی ہیں اور خلقت کا اثر دھام، خدائی خوار یوں مارا مارا پھرتا ہے جیسے کہیں سے ٹڈی دل نکل پڑا ہو۔ بھلے آدمی کو، دیکھے سے وحشت ہوتی ہے ایسے میں بس اپنا گھر بھلا اور آپ۔ جو لوگ میری طرح ہوسِ دنیا سے بھرپائے وہ گوشہٴ عافیت میں پڑے رہتے ہیں اللہ خیر صلا۔ نہ دلی کا یہ حالِ خراب دیکھیں گے نہ آنکھوں سے لہو کی دھاریں نکلیں گی۔

میاں اب یہ شہر غالب کے زمانے کا کیمپ اور چھاؤنی نہیں، خدا آباد رکھے منڈی بن گیا ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے ایشیا میں یہاں کے بیوپاریوں نے تجارت کا میدان مارا ہے کروڑوں روپے کی روز کوٹ پھیر ہوتی ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہاتھی مرے پر بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے وہ اب دلی کا حال ہے۔ کبھی یہ بین الاقوامی شہر نقاسیاح فن کار اور ہنرمند چار کھونٹ سے یہاں آتے اور اپنے کمالات کی داد پاتے تھے اب وہ اہل علم اور اہل کمال نہیں آتے یا کم آتے ہیں تو ان کی جگہ ہزاری بزاری کاروباریوں نے لے لی۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ دلی میں تجارت کو بڑی کم لگا ہی سے دیکھا جاتا تھا اس لئے نہیں کہ ان سے خدا واسطے کا بیر تھا بلکہ اس لئے کہ یہ بیچارے رات دن ننانوے کے پھیر میں پڑے رہتے ہیں۔ صبح اٹھے اور چابیاں لے کر دکان کو سدھارے، شام کو آ کے گھر میں پڑ رہے۔ دلی والے

جو اپنے تئیں فخر سے دلی والا کہتے تھے وہ کئی کئی گھڑیاں دیوان خانوں میں گزارتے تھے۔ ادھر ادھر کی گپیں ہانکتے جب زبان خیراد پر چڑھتی تھی اور دماغ یوں پرواز کرنے لگتا جیسے معجونِ فلک سیر کھاتے ہوں۔

دلی کے دکان داروں کی بھی عجیب شان تھی۔ صبح نو دس بجے تو گھر سے نکل کر جاتے تھے۔ ذرا دوپہر ہوئی اور سورج نے سر اٹھایا تو اسخوں نے نوکر سے کہہ کے پردے چھڑوا دئے۔ سفید براق چاندنی پر گاؤ تکیہ اور بغلی تکیے لگائے مزے سے بیٹھے رہے جو کوئی اللہ کا بندہ ان کی روزی کافرشتہ بن کے آتا اسے بٹ لیتے تھے یہ نہیں کہ آتے جاتے کو بیسواؤں کی طرح اشاروں سے بلارہے ہیں پڑوسی دکانداروں کی ٹوہ میں لگے بیٹھے ہیں۔ یہی کوشش کرتے ہیں کہ بس ایک میں رہ جاؤں اور ساری دنیا سے دکانداروں کا اوڑا پھر جائے تو بہ تو بہ انہی باتوں سے آدمی خوار ہوتا ہے۔ انسانیت سے گر جاتا ہے ہاؤ ہاؤ جو کرموں لکھا سو پاؤ۔ بھئی فصیل کے اندر جو دکاندار تھے، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، بڑے سیر چشم تھے۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے یاں تک سنا ہے کہ جب ان کی بھرت پوری ہو جاتی تھی تو گاہک کو پڑوس میں بھیج دیتے تھے، اول تو جہاں گلے میں روٹی دال کے پیسے آئے اور اسخوں نے نوکروں کو حکم کیا کہ چلو بھئی دکان بڑھا دو اب کہیں سیل سپاٹے کو جائیں گے۔

دلی کے ہر گھر میں ڈیوڑھی کے ساتھ دیوان خانہ یا بیٹھک ہوتی تھی شام بڑے احباب یہاں جمع ہوتے اور دیر تک باتیں کیا کرتے تھے۔ باہر والوں کو جب دلی والوں پر تنقید کرنا مقصود ہوتی ہے تو ناک چڑھا کر کہتے ہیں میاں انہیں مرچیں کھانے اور باتیں بنانے کے علاوہ آتا ہی کیا ہے۔ چلئے اگر ہم صرف اتنا ہی مان لیں تو بھی یہ ہنر کیا کم ہیں۔ مرچ مسالوں سے وہ چٹ پٹی چیزیں ایجاد کی ہیں کہ ان کا ذکر کیجئے تو منہ میں پانی آتا ہے۔ باہر والے الوداع کی نماز پڑھنے دلی آتے ہیں

تو سینکڑوں روپے چاٹ جاتے ہیں۔ ایک نہہاری کو ہی لے لیجئے جس کے مُٹہ لگتی ہے پھر نہیں چھوٹی۔ بامَن کی لڑکی کھائے تو کلمہ پڑھنے کو تیار ہو جائے۔ خدا غریقِ رحمت کرے چچا کبابی کو، جامع مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے شمالی دروازے کی جانب بیٹھتے تھے ان کا کہنا یہ تھا کہ ان کے پاس وہ مسالے ہیں کہ کھڑے بجا رہے ہتھیر دیں تو گل کے گر پڑے۔ یہ تو رہی مرچیں کھانے کی بات۔ اب ذرا باتیں بنانے کا بھی ذکر ہو جائے۔ کون ہے جو ان کے سامنے زبانِ دانی کا دعویٰ کرے اور خجالت سے پانی نہ بھرے جن بزرگوں نے کل تک شاہد احمد دہلوی، ملا واحدی، مرزا محمود بیگ، اشرف صہوجی اور خواجہ محمد شفیع کی باتیں سُنی ہیں وہ آج تک ان باتوں کا مزا لیتے ہیں۔ خدا کرے ان بزرگوں کی روح نہ شرمائے گالیاں دیتے تھے تو سننے والوں کو جھڑی بوٹی کے بیروں کا مزا آتا تھا۔

میری تو ابھی عمر ہی کیا ہے، جما آٹھ دن کی پیدائش ہے خیر سے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔ میں نے دلی کا عروج تو کیا زوال بھی نہیں دیکھا۔ بٹوارے سے پہلے میرا بچپن تھا بس اسی زمانے کی کچھ پرچھائیاں ذہن میں محفوظ ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ پھر ایسی شاومانی، میل ملاپ اور محبت دیکھنے کو آنکھیں ترستی رہیں، دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ کہتے ہیں اچھے دنوں کی یاد آدمی کو ستاتی رہتی ہے۔ سو یہی ہمارا حال ہے۔ جانتا ہوں کہ اب وہ دن لوٹ کر نہیں آنے کے۔ پر کیا کروں دل سے ان دنوں کی یاد بھلائی نہیں جاتی۔ بچپن کے کھیل کود، بزرگوں کی شفقت، دوستوں کا ایثار، عزیزوں کا اخلاص، ادبِ آداب، صفائی ستھرائی، وضعِ داری اور سفید پوشیاں، سب جوں کی توں مجھے یاد ہیں۔ ایک مبہم سا خیال جی کو گدگدانا ہے کہ اگر ان قدروں کی تجدید کے لئے کوشش کی جائے تو شاید بنی نوع انسان آج کی آپادھاپی اور نفسا نفسی سے باز آجائے، بقائے باہم اور انسانی ہمدردی

کاجذبہ لوگوں میں پیدا ہو کر ہماری زندگی ایک بار پھر مسرتوں سے ہمکنار ہو جائے۔
 قدیم دلی والے ہمیشہ کے خوش دل، خوش اطوار، خوش طبع، اور خوش کلام ہوتے تھے۔
 انھوں نے صد درویشانہ زندگی اختیار کی ان کی نظر میں معاشی پستی اور بلندی کے
 کوئی معنی نہ تھے۔ انھوں نے مال کے بجائے کھال میں مست رہنا سیکھا تھا۔ دلی والا
 مفلسی اور ناداری کے نام سے بھی آشنا نہ تھا۔ اس کی شانِ استغنا نے اسے ہمیشہ
 ہی تو نگر رکھا۔ ادھی پاؤلی کے مزدور نے بھی یہاں کسی سے بات کی تو دیو جانس کلبی کا سا
 تیکھا پن دکھایا۔ دلی والوں کی نازک مزاجی اور بے نیازی ہمیشہ ضرب المثل بنی رہی۔
 وہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ سچ ہے جب کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلا نا،
 جاہ و مال کی ہوس نہیں، نام و نمود جوتی کی نوک پر تو پھر لتو چپو کرنے سے کیا فائدہ
 یہاں کے کاری گرا اپنے اپنے فن میں طاق، عدا تم المثال اور مزاج دارا ایسے ہوتے تھے کہ
 اگر آپ انہیں قارون کا خزانہ بھی دیں تو آپ کی چاکری نہ کریں۔ ان کے پاس فن
 تھا۔ اسی کے بل پر معاش کرتے تھے کسی کی غلامی مول لے کر آقا کی ناک بھوں دیکھنا
 انہیں گوارا نہ تھا۔

دلی والوں کو اپنی جان بنائے رکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اس شوق کو پورا کرنے
 کے لئے وہ ورزش کیا کرتے تھے۔ ہر گھر میں مکدروں کی جوڑی ضرور ہوتی تھی دیسی
 ورزش سے سینہ چوڑا اور کمر چھلا سی ہو جاتی تھی۔ ورزش کا شوق دلی میں اس وجہ
 سے تھا کہ ان دنوں چست لباس پہننے کا رواج تھا لوگوں کو اپنے جسم صحت مند
 اور سڈول بنانے کی دھن لگی رہتی تھی۔ پھنسے ہوئے انگرکھے اور تنگ پجامے
 اس وقت اچھے لگتے ہیں جب ڈنڑ اور پنڈلیاں بھری بھری ہوں۔ سرکنڈوں
 سے ہاتھ پاؤں بھلا چکن اور ململ میں کیسے اچھے لگ سکتے ہیں۔ سوکھے سہموں
 پر تو یہاں کاغذ کے پٹے باز کی بھیتی کسی جاتی تھی۔ دلی کے کچھ فن ایسے تھے جن میں

یہاں والوں نے کمال حاصل کیا تھا۔ بنوٹ کا فن بھی ایسا ہی ایک فن تھا جس کو جاننے والا قوی سے قوی حریف کو نیچا دکھا سکتا تھا۔ یہ دراصل ”بن اوٹ“ ہے یعنی اس کی کوئی روک نہیں ہے۔ استاد گھنٹوں اس کے پنتیروں کی مشق کراتے تھے۔ بنوٹیوں میں مچھلی کی سی تڑپ ہونی چاہیے اگر چستی پھرتی نہیں ہوگی تو مار کھا جائے گا۔ لدھڑ آدمی کا کام نہیں تھا۔ آنکھوں سے تو دیکھا نہیں ہاں کان گنہگار ہیں کہ ایسے ایسے بنوٹے ہو گزرے ہیں جو تلوار پیئے سے تلوار چھین لیتے تھے اور اس کی گٹھری بنا کر ڈال دیتے تھے۔ کہنے والے یہاں تک کہتے ہیں کہ چار پائی کے نیچے کبوتر چھوڑ دیجئے کیا مجال جو بنوٹیا اسے نکل جانے دے۔ یہی کیفیت بانک پٹہ، گتکہ، چھری اور علی مد کے ہنرمندوں کی تھی۔ بجلی سی چمکی اور حریف ختم دلی کے غلیل باز بھی بلا کا نشانہ لگاتے تھے۔ ارجن کے بان کی طرح مچھلی کی آنکھ پر وار کرتے تھے۔ غلے خاص طور سے مٹی میں روئی ملا کر بنائے جاتے تھے۔ مشاق غلیل باز ایک غلہ ہوا میں اوپر مارتے اور جب وہ غلہ واپس آنے لگتا تو دوسرا غلہ اس پر مارتے تھے۔ دونوں غلے ٹوٹ کر ہوا میں بکھر جاتے تھے۔ میر پنجه کش کے پنجه لڑانے کی بت تو بہتوں نے سنا ہوگا۔ بلا کے خوشنویس ہونے کے باوجود پنجه کشی کی ایسی رکاوٹیں جانتے تھے کہ جس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا وہ مرنے مر گیا انگلیاں نہ موڑ سکا۔ جب خود زور لگایا تو دوسرے کا پنجه موم کی طرح موڑ دیتے تھے۔

ورزشی کھیلوں کے علاوہ لوگ گھروں میں گنجفہ، شطرنج، چوسر، بچسی اور نوکنرا کھیل کرتے تھے۔ شطرنج کے بعض ایسے کھلاڑی بھی ہوتے تھے جو غائبانہ کھیلتے تھے یعنی ان کے سامنے شطرنج کی بساط اور مہرے نہیں ہوتے تھے بس یہ بتا دیا جاتا تھا کہ سامنے والے نے یہ چال چلی ہے وہ جواب دیتے ہماری طرف سے فلاں مہر چل دو۔ ان کے ذہن میں شطرنج کا پورا نقشہ جمار ہوتا تھا۔ اُدھر کئی کئی کھلاڑی لگے رہتے اور ادھر اکیلے ہوتے۔ پھر بھی جیت انہیں کی ہوتی تھی۔ دلی کی

پتنگ بازی بھی مشہور تھی۔ بڑے بڑے ہاتھ لگتے تھے۔ ابھی کل کی بات ہے شاہ بڑے پر پتنگ بازی کے ایسے مقابلے ہوتے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ دنوں پہلے سے مانجھے سوتے جاتے۔ آرڈر پر تکلیں بنتی تھیں۔ جہاز کی جہاز پتنگیں ہوتیں اور انہیں اتنی دور تک بڑھایا جاتا کہ وہ دریا پار نکل جاتی تھیں۔ پھر جو کھنچائی ہوتی تو گڈیاں سدھ ہو جاتی تھیں اور کچھ پتنگ باز ایسے تھے کہ صرف ڈھیل کے نیچے لڑاتے تھے۔ ان کی انگلیاں سدھی ہوئی تھیں۔ جدھر چاہتے پتنگیں جھونک کھا جاتی تھیں۔ بل دینے پر آتے تو تگنی کا ناچ نچا دیتے۔ بچنے والا لاکھ بچاتا لیکن ان کے پھندے سے نکلنا مشکل تھا منہ سے منہ ملے اور دونوں حریفوں نے ڈھیل دینی شروع کر دی۔ سیروں ڈور پلا دیتے تھے۔ ایک نے ذرا پیٹا چھوڑا کہ دوسری نے وہیں غوطہ مارا وہ کاٹا وہ کاٹا کاشور مچ گیا۔ کٹی ہوئی پتنگ کی ڈور ہاتھ پر سے توڑ دی جاتی تھی۔ غریب لوٹنے والے لوٹ لوٹ کر بڑی بڑی انتیاں بنا لیتے تھے۔ اسی ڈور اور لوٹی ہوئی پتنگ سے وہ اپنا دل بہلاتے تھے۔

دلی میں فالس پر جانا بھی رواج بن گیا تھا۔ گرمیوں کی چاندنی رات میں لوگ اپنے ساتھ باکمال گانے والیوں کو لے کر فالس پر پہنچ جاتے تھے رات بھر کامیلا ہوتا۔ سفید سفید چاندنیوں کے فرش پر پہلے لمبے چوڑے دسترخوان بچھتے پھر کھانے سے فارغ ہو کر جو گانے کی محفل ہوتی تو لوگ جھوم جھوم اٹھتے تھے۔ بڑی ٹھسے دار مجرے والیاں تھیں غزل گا کر سمجھاتیں تو ایک ایک مصرع دلوں پر نقش ہو جاتا تھا۔ ان گانے والیوں کے رعب حسن سے تماشا بنی تھراتے تھے مجال نہیں تھی کہ کوئی نظر بھر کر دیکھے۔ آگے چل کر جب طوائفوں کا بازار بند ہوا اور اس فن میں چھپو رہن کا دخل بڑھنے لگا تو دلی والوں نے ایک اور کھیل ایجاد کیا۔ لوگ بڑے بڑے بھونپولگے گراموفون لے کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔ ایک طرف سے کوئی ریکارڈ بچایا جاتا تو دوسری طرف سے

اسی موضوع پر اس سے اچھا ریکارڈ بجا جانا تھا۔ کیا خوب انتخاب ہوتا تھا جس نے یہ محفلیں دیکھی ہیں وہی ان کی داد دے سکتا ہے۔ خلیفہ ایسے ایسے ریکارڈ لے کر آتے تھے کہ سُننے والوں کی چیخیں نکل جاتیں۔ پھر حافظہ اس بلا کا کہ پل بھر میں وہ ریکارڈ نکال لیا جاتا تھا جس سے دشمن کا منہ بند کیا جاسکے۔ موسیقی کے یہ مقابلے تو ابھی کچھ دنوں پہلے تک عام تھے۔ خدا بھلا کرے ریڈیو اور ٹیلیوژن جیسی ایجادوں کے ارزاں ہو جانے کا، انھوں نے دلی والوں سے یہ مزے بھی چھین لیے۔ اب کسی کو آپ کی پسند کا خیال نہیں رات دن ریڈیو ٹیلیوژن اور لاؤڈ اسپیکر پر جو گانے پیش کئے جاتے ہیں انہیں سن کر چاہے سر دھننے یا سر پیٹنے کسی کو کچھ سروکار نہیں بُرے بھلے سب ایک لکڑی ہانکے جاتے ہیں۔ موقعہ محل کسی بات کا خیال نہیں بس ایک شور سُنائی دیتا ہے اور اعصاب جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ تو بہ تو یہ کیا ذوق سماعت ہے سرتال کسی کا پتا نہیں اور موسیقی سے شغف رکھتے ہیں پرانے دلی والوں کا تو یہ حال تھا کہ جہاں گویا بے سُرا ہوا انھوں نے خود انگلیوں کی حرکت سے اس کی اصلاح کر دی۔

دلی میں ایک بدنام طبقہ کر خنداروں کا تھا۔ باہر والوں نے تو انہی کو دلی کی شناخت بنا رکھا ہے۔ ”اے مُنتیازورے آیتو پیارے قسم اڑان جھلے کی ایسا شعر سناؤں گا کہ مچھلی کی طریوں تڑپھنے لگے گا“ ان کے لب و لہجے کی یار لوگ بھداڑاتے ہیں۔ اتنا نہیں جانتے کہ اٹھارویں صدی کی اردو انہی کی زبان پر محفوظ ہے۔ جتنے متروکات ہیں یہ لوگ بے دریغ استعمال کرتے ہیں اگر یہ ایسا نہ کرتے تو نہ جانے کتنے الفاظ اردو لغت کے خزانے سے محو ہو جاتے۔ کر خندار کھانے پینے کے شوقین ہوتے ہیں۔ رات کو کارخانے سے گھر لوٹتے ہیں تو کبھی فلا قند، کبھی حلوا سوہن، کبھی ملائی کے پیڑوں کی ٹوکریاں لے کر لوٹتے ہیں کر خندار تو آج بھی موجود ہیں اور ان کے کھانے پینے کا شوق بھی برقرار ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اب وہ کھانے پینے کی چیزیں نہیں رہیں۔ گھی،

دودھ، اور ان سے بنی ہوئی چیزیں اول تو ملتی ہی نہیں اور اگر ملتی ہیں تو ایسی کہ انہیں کھا کے آدمی بیمار ہو جائے۔ پھل پھول تک دنیا سے ناپید ہو گئے، کم بخت دوائیوں سے پیدا کئے جاتے ہیں اور شقوق کے مزے کے ہوتے ہیں خیر کھانے والے ثواب بھی کھاتے ہیں۔ جنہوں نے اگلے دنوں کے مزے نہیں چکھے ان کے لئے یہی نعمت کی اماں کا کلیجہ بنے ہوئے ہیں مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ کر خندار بے چاروں کے کن ٹوٹ گئے۔

مشین کی آمد سے پہلی سی مزدوریاں نہیں رہیں۔ ہاتھ کی کاریگری کے زمانے لد گئے۔ جو کر خندار اپنے فن کے سہارے بیٹھے ہیں ان کے گزارے نہیں ہوتے جنہوں نے مشینیں لگالیں ان کے دل مر گئے۔ وہ پہلے سے حوصلے نہیں رہے ہاتھوں سے بھروسہ اٹھ گیا تو شاہ خرچیاں ختم ہوئیں۔ کر خنداروں کے دم سے دلی کے میلے ٹھیلے تھے۔ سلطان جی میں سترھویں ہوتی تو ایک ڈیڑھ مہینے پہلے سے کام میں جُٹ جاتے تھے۔ خوب محنت سے کماتے اور سینت سینت کے رکھتے رہتے۔ مہلہ بھرتا تو اس میں جاتے اور ساری کمائی بہا دیتے تھے۔ سترھویں کے بعد کاریگر کئی کئی دن تک کام پر نہیں لوٹتے تھے۔ تھک کے چور ہوئے پڑے رہتے جب ذرا نشہ اترتا تو پھر سے دھیانگی پہ لگ جاتے تھے۔ بسنت کے موقع پر محلدار خاں کے باغ میں ایسی محفل گرم ہوتی اور داد عیش دی جاتی تھی کہ اس کا بیان سن کے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ برسات میں امریوں کی سیر کی جاتی تھی۔ جہاز محل اور اولیا مسجد کے تلاؤ پر بیٹھ کر آم پراٹھے کھائے جاتے تھے مہرولی کی ملائی بہت مشہور تھی۔ خوش خوراک کھانے بیٹھنے تو سروس ملائی چٹ کر جاتے تھے۔ دلی والوں کے برسات میں چنُونے کاٹتے تھے سر پر بوند پڑی اور ان کی آنکھوں میں ہوا بھری۔ مہرولی میں درگاہ بازار کے پاس مستقل کمرے بنے ہوئے تھے جو سیلابیوں کو کرائے پر اٹھائے جاتے تھے لوگ آن آن کے یہاں

ٹھہرتے اور برسات کے مزے لوٹتے تھے۔ سیچ پوچھتے تو دلی شروں کے بعد ان ہی کر خنداروں سے آباد تھی۔ کاریگروں کے گھرانے ان کے دم سے پلتے تھے۔ خود شاگردوں کی شادی سے لے کر ان کے بیٹے بٹاروں رشتہ ناطوں تک کی ذمہ داری ان ہی کر خنداروں کی ہوتی تھی۔ سات سات بیٹیاں اپنے کاریگروں کی، کر خنداروں نے بیاہ دیں۔ سعادت مند شاگرد بھی اپنے استاد کا باپ سے زیادہ احترام کیا کرتے تھے۔ استاد جی ناراض ہوتے تو بال بچے دار کاریگر کو لکڑی لے کر دھن ڈالتے تھے۔ ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ کر خنداروں کو انگریز نے سوچی سمجھی سیاست کے تحت بدنام کیا تھا۔ بات یہ تھی کہ ان کے ہندوستان پر قابض ہونے کی مخالفت میں کاریگروں نے ان کے ساتھ عدم تعاون کیا تھا۔ جو لوگ قلعہ والوں کی خدمت میں لگے رہتے تھے انہوں نے انگریز آقاؤں کے لئے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ زندگی گزارنے کے لئے چھوٹی چھوٹی صنعتیں اپنائیں اور گھروں میں بیٹھ گئے یوں دلی والوں میں کر خنداری کا رواج ہوا تھا۔ کارخانے دار وہ غیور لوگ تھے جو انگریزی عمل داری کے بعد دربار سے کسی قسم کا تعاون کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ اللہ پر بھروسہ کر کے انھوں نے چھوٹے موٹے کام کرنے شروع کر دیئے اور رفتہ رفتہ یہ ایک ایسا ادارہ بن گیا کہ آزادی کی تحریک میں انہیں کی جمیعت نے دلی میں انگریزی سرکار کا سکہ بیکار کر دیا تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ شہر کے امرا اور رؤسا جو اپنی مالی ضرورتوں کے لئے ان کے آگے جھکنے پر مجبور ہو چکے تھے اس خود مختار اقتصادی طبقے سے دور رہیں چنانچہ انھوں نے کر خنداروں کو بدنام کرنے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بنایا۔ ہم اس منصوبے کا شکار ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک بے چارے کاریگروں کو برا کہا جاتا ہے۔ دلی میں بھی کچھ لوگ ان کی بولی کا، ان کے طور طریقوں اور سیلانی زندگی کا، ان کی صاف گوئی اور جرأت مندی کا، ان کے معاشی طور پر ناعاقبت اندیش ہونے کا مذاق اڑاتے

ہیں۔ ہم نے تو خدا گواہ ہے، ان میں کوئی برائی دیکھی نہیں۔ محنت سے کھاتے ہیں اور دریا دلی سے بہاتے ہیں۔ آج کھایا آج کھالیا کل کھائیں گے کل کھالیں گے۔ باقی بچے نہ کتا کھائے اب اگر آپ کہیں ان کا کوئی اثاثہ نہیں ہے۔ نام نہاد ترقی کے لئے انہوں نے کچھ نہیں کیا، یہ دس بیس سال آگے کی نہیں سوچتے تو واقعی یہ آج کے پیمانوں پر پورے نہیں اترتے مگر اللہ یہ بھی تو بتائیے کہ آپ نے اپنے دور کو ایک مثالی دور کیوں سمجھ رکھا ہے۔ ماہرین اقتصادیات کا کہنا ہے کہ دولت اور پانی کے رکنے سے سماج میں تعفن پیدا ہوتا ہے۔ اب دلی میں کرشندار ہی کہاں رہے جو اُن کا فسانہ بیان کیا جائے۔ دوچار نمونے کے طور پر پڑے ہوں گے سو وہ بھی، کے دن کے حالات کا جبر بہت برا ہوتا ہے آدمی کو جوتے مار مار کے بدل دیتا ہے۔ دلی کے ساتھ دلی کے کارخانے دار بھی قصہ پارینہ ہو گئے اب رہا کیا ہے جس کا ماتم کیا جائے۔ دلی کی عورتوں کا ٹھسا باہر والوں کی بیگموں سے بڑھا ہوا ستھاناک چوٹی گرفتار یہ عورتیں اپنے آگے کسی کو گر دانتی نہیں تھیں۔ باہر والوں کے لب و لہجے، گفتگو، رہن سہن، رسم و رواج پر ایسی بھینٹیاں کستی تھیں کہ وہ سنتے تو تلملا اٹھتے تھے۔ شہر کے باہر رشتے ناٹے کرنے کا تو یہاں رواج ہی نہیں تھا جو کسی کا لحاظ کیا جاتا مثل مشہور ہے دلی کی بیٹی متھرا کی گائے، کرم پھوٹے تو باہر جائے اسی لئے معاشرے میں ایک خود پسندی پیدا ہو گئی تھی۔ عورتیں تو ہر جگہ کی اپنے جو بن میں تُلنتی رہتی ہیں، دلی والیاں بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھیں۔ محفلوں میں ان کے نخرے لئے نہیں جاتے تھے۔ لباس ایسا بہتیں کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جائے۔ بفت، کم خواب، تاش، تمامی، سے کم تو یہ بات ہی نہ کرتی تھیں۔ تہہ پوشیاں ایسی کہ ان کے پانچے خادمہ اٹھائے چلتی تھی۔ گھنے پاتے سب سے درست سر سے پاؤں تک گوندنی کی طرح لدی ہوئی، سونے میں پیلی ہوتی تھیں۔ میاں کی آدھی کمانی تو پان کھا کر تھوک

دی جاتی تھی۔ اس آن بان کے باوجود غیرت کا یہ عالم تھا کہ اگر کبھی بُرا وقت پڑتا تو منہ سے اُف نہ نکلتی تھی۔ تنگی ترشی میں بھی انہوں نے اپنی آن بان کو برقرار رکھا دو دو دن کڑا کے کے فاقے سے گزار دئے مگر انگلیٹھی جلا کے اس پر پتیلی میں پانی چڑھا دیا تاکہ محلے والوں کو یہ نہ پتہ چلے کہ آج ان کے ہاں فاقہ ہے۔ قرض مام کرنے سے انہیں عار آتی تھی۔ جو کچھ پڑتی ہنسی خوشی سہہ لیتی تھیں۔ ہاتھ ان کے خود ہنر آشنا تھے۔ بُرے بھلے وقت میں زردوزی، تارکشی، کامدانی اور کیکری کٹاؤ کر کے خود بھی گزر کرتیں اور شوہر کا بھی ہاتھ بٹاتی تھیں۔ حسنِ سادگی اور معصومیت ایسی کہ حوریں اور پریاں ان کے آگے پانی بھریں۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں، پہاڑی طوطے کی چونچ جیسی ناک، کشادہ پیشانی، تھوڑی ایسی جیسے طوطا پری آم کی کیری، میدہ شہا رنگ، چھلا سی کمر، متناسب قد و قامت نہ اتنا لمبا کہ لوگ سرانچے کا بالنس کہیں نہ اتنا چھوٹا کہ ٹھگنا کہلائے، گاؤ دم پنڈلیوں تک پڑی چوٹی میں گندھی کالا بھونرا سی زلفیں غرض یہ کہ انہیں دیکھ کر مصحفی کا کہا یاد آتا تھا، ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلی والیاں، اسی پر تہج اور سلیقہ کا یہ عالم کہ سوئی کے ناکے سے ہاتھی گزار دیں۔ اتنی سی ہلدی اور سارے گھر میں ہلدی، جس گھر میں جانتیں اسے جنت بنا دیتی تھیں۔ کھانے پکانے، سینے پرونے اور دیگر امور خانہ داری میں طاق، دسوں انگلیاں دسوں چراغ، دلی میں عورتوں کا گھر سے نکلنا عیب سمجھا جاتا تھا۔ خواتین گھروں کا دیا تھیں، رواں دواں پھرنے والی پچھل پائیاں نہ تھیں۔ ادھر میٹھا برس لگتا اور ادھر ہاتھ پیلے کر دیئے جاتے تھے۔ لوجی لڑکی پرائے گھر کی ہوئی۔ نہ کمانے دھمانے کی فکر نہ موئے لڑکوں کے ساتھ کالج کی پڑھائی، اللہ رسول کا نام لینا سیکھ لیا، خط کتابت کی استعداد حاصل کی، اچھی بری بات میں تمیز کرنا آیا بس یہ علم زندگی گزارنے کے لئے کافی سمجھا جاتا تھا۔ ان دنوں لوگوں کا عقیدہ یہ تھا

عورت کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔ ایک کمانے والا اور دس کھانے والے ہوتے تھے اس پر بھی یہ عالم تھا کہ جھاڑو بھارو کے لئے ماما، بچے پالنے کے لئے انا، چھو چھو سلائی کڑھائی کے لئے مغلانیاں اور بناؤ سنگھار کے لئے مشاطہ ملازم رکھی جاتی تھیں۔ کہیں جانا آنا ہوتا تو ڈولی چڑھ ٹھمک ٹھمک کرتی وہاں پہنچ جاتی تھیں۔ ہمارے ہوش کی بات ہے کہ جب دروازے پر ڈولی لگتی تو گھر والے گلی کے رخ چادر تانتے تھے۔ اترتے وقت بھی پردے کا یہی اہتمام کیا جاتا تھا کہ ہار آواز لگانے "سواریاں اتر والو" گھر کی عورتیں ڈیوڑھی میں آ کے انہیں اتر والیتی تھیں۔ کہار بھی جلتے ہی کے ہوتے تھے۔ انجانے کہاروں کی ڈولی میں شریف عورتیں سوار نہیں ہوتی تھیں۔

گھر کی چہار دیواری تک محدود زندگی کی تہذیب میں گھر بیٹھے ضرورت کی چیزیں خریدی جاسکتی تھی۔ سنا ہے شاہجہاں نے دلی شہر آباد کیا اور اس کے مختلف محلے بس گئے تو خرید و فروخت کے لئے نزدیک دورا اعلان کر دیا کہ تاجر اور خوردہ فروش ہر چیز کے گلی گلی آواز لگا کے اپنی اجناس بیچا کریں۔ چنانچہ یہ عالم تھا کہ پردہ دار عورتیں اپنی ڈیوڑھی پر ہی کل سامان خرید لیا کرتی تھیں۔ ہر محلے میں قصائی، کنجڑے، تیلی، تنہولی، بنئے اور بساطی کی دوکان ضرور ہوتی تھی۔ بچہ بھی بے خطر سودا لے آیا کرتا تھا۔ گلیوں میں رات گئے تک سودے والوں کی سریلی آوازیں گونجتی رہتی تھیں۔ ان آوازوں میں ایسی شیرینی پائی جاتی تھی کہ چھوٹے موٹے شاعروں کا کلام بھی ان کے آگے ہیچ ہے۔ قطب صاحب کی کھرباں، ٹکھنوی کی جلیسیاں، خربوزے شیدی عنبر کے باغ کی کھجوریں، کیوڑے کی بیل کے سنگھاڑے اور کالے پہاڑ کی کچیریاں بیجوں سے مٹھیاں کی آوازیں دلی کے اجڑے کھجڑے بازاروں میں آج بھی سنائی دیتی ہیں۔ رات گئے تنگ پھول والے گجراتی موتیا کے کٹورے بیچنے آتے تھے۔ مرد پھیری والوں کے علاوہ عورتیں بھی ضرورت کی چیزیں گھروں میں آ کر دے جایا کرتی تھیں۔ ذرا

دن چڑھا تو کاچھن اپنا چھیلے آن پہنچتی تھی۔ اس کے کچا لودا بدلا کر کھائے جاتے تھے۔ بیسہ دو بیسہ میں ایسا مزے دار پتہ بنا کر دیتی کہ آدمی ہونٹ چاٹنے لگتے۔ ابلے ہوئے آلو، شکر قند، امرود، لمرخ، کھیرا، لکڑی، کیلا، پیتا، سب کے دو دو قتلے ڈھاک کے ایک صاف ستھرے پتے پر رکھ کر کالی مرچیں، لال مرچیں، لاہوری نمک، کالا نمک شکر اور نہ جانے کیا کیا ایک ایک چٹکی ان پر رُب کر دیتی تھی۔ کھانے والیاں سری کی تیلی سیکوں سے ایک ایک قتلہ کھاتیں اور دیر تک سوسو کرتی رہتی تھیں۔ برسات کے موسم میں یا تیج نہوار اور، پر منہا رہیں گھروں میں چوڑیاں پہنانے آتی تھیں۔ لڑکی بالیوں کو چوڑیاں پہناتی جاتیں اور دعائیں دیتی رہتی تھیں۔ دعائیں دینے کا رواج دلی میں ہمارے بچپن تک تھا۔ جو عورت بھی کسی کام سے گھر میں آتی، دیوڑھی میں قدم رکھتے ہی دعائیں دینی شروع کر دیتی تھیں۔ اللہ سلامت رکھے، بچے جئیں، دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو، سر کی بادشاہی بنی رہے، روزی روزگار میں برکت ہو، سر کا حکم بنا رہے۔ کرکینوں کی بول چال بھی شریف گھرانوں میں آنے جانے کی وجہ سے منجھ گئی تھی۔ دلی کی مہترانیوں کی زبان تو اس قدر ستھری ہوتی تھی کہ باہر والے ان سے دلی کی زبان سیکھتے تھے۔

ڈاکٹر فیلن جس کی انگریزی اردو ڈکشنری مشہور ہے اس گھمنڈ میں تھے کہ انہیں اہل زبان سے کہیں زیادہ اردو آگئی ہے۔ سید احمد دہلوی فرہنگ آصفیہ والوں نے صاحب کو بتایا کہ دلی کے شرفار کا تو ذکر ہی کیا آپ چھوٹی امت جتنی بھی اردو نہیں جانتے۔ فیلن صاحب ان کی یہ بات سن کر سرخ ہو گئے، بولے ”آپ میرا متیٰ نہ لیجئے۔“ اتنے میں ایک مہترانی اپنا ٹھیکرا اٹھائے سامنے گزری۔ سید صاحب نے کہا ”ذرا سی سے بات کر لیجئے، ہاتھ گنگن کو آرسی کیا ہے۔ صاحب نے کہا ”بلا واسے“ سید صاحب نے مہترانی کو آواز دی، ”اے بوا ذرا یہاں آنا“ صاحب تم سے بات

کرنی چاہتے ہیں، مہترانی نے آکر کہا ”فرمائیے کیا بات کرنی چاہتے ہیں“ صاحب نے کہا ”تم ہم سے کچھ پوچھو“ وہ سٹ پٹائی کہ یہ گورا آخر چاہتا کیا ہے کہیں سٹھیا تو نہیں گیا موا، سید صاحب نے کہا ”تم ان سے کسی محاورے کے معنی پوچھو مہترانی نے کہا ”اچھا تو میں اس ٹوکرے کو لپک کر ڈلاؤ پر ڈال آؤں پھر پوچھوں گی“ صاحب بغلیں جھانکتے رہ جائیں گے، ڈاکٹر فیلس کے کان کھڑے ہوئے کہ مہترانی ایک ہی فقرے میں دو باتیں ایسی کہہ گئی جو مجھے معلوم نہیں ہیں۔ مولوی صاحب سے پوچھا ”کیوں مولوی صاحب ڈلاؤ کسے کہتے ہیں اور بغلیں جھانکنا کیا ہوتا ہے“ سید صاحب نے کہا ”تیل دیکھتے تیل کی دھار دیکھتے، ابھی تو دیکھتے وہ واپس آکر کیا پوچھتی ہے“ اتنے میں مہترانی واپس آگئی، بولی ہاں صاحب بہادر بتاؤ ”اگن کے بچے کچھوروں میں“ کا کیا مطلب ہے ”صاحب واقعی بغلیں جھانکنے لگے مہترانی نے کہا، ”بس ہو گئی تر کی تمام، پھٹے سے منہ، صاحب کا سارا علم دھرا کا دھرا رہ گیا۔ اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ دلی کی مہترانیوں کا قیاس آج کل کی مہترانیوں پر نہ کیجئے۔ ان کی زبان ہی ستھری نہ تھی کپڑے بھی صاف ستھرے پہنتی تھیں گلے میں مونیا کا موٹا سا کنٹھا، دونوں ہاتھ چاندی کی چوڑیوں سے بھرے ہوئے، کلابیوں میں دس دس تو لے چاندی کے کڑے کانوں میں پتے بالیاں، ناک میں سونے کی کیل، مستی ملی ہوئی دانتوں کی ریخیں، ہونٹوں پر لاکھا، چوٹی میں رنگیں موباف۔ جب گھر میں آئیں تو سلام دعا کر پھسکڑا مار کے صحن میں بیٹھ جاتی تھیں۔ گھر کی بیگمیں کھلا ہوا پان پیش کرتیں اور وہ انہیں شہر بھر کے قصے سنانے لگتی تھیں۔“ اے بیگم کچھ سنا تم نے، پیش کار صاحب کی لڑکی کی بات ٹوٹ گئی، لو بیوی غضب خدا کا کیا زانہ آگیا ٹھیکرے کی مانگ تھی ون کی اور وہ تحصیلدار صاحب ہیں اونچی ڈیوڑھی والے ون کے ہاں جو چھو کری ملازم ہے وس نے تحصیلدارنی کی انگوٹھی چیرالی۔ جب چار

چوٹ کی مار پڑی تب قبولی اور نیفے میں سے انگوٹھی نکال کر دی مردار نے، کلوڈ مصلے کے ہاں کل وہ چوک پڑا کہ الہی تو بہ اے کوئی بات بھی ہو گھر والی نے کہیں یہ کہہ دیا کہ اب خیر سے لڑ کی سیانی ہونے کو آئی اس کا کچھ فکر کرو۔ بس بیگم وہ تو نہ جانے کب سے بھر اسیٹھا تھا ورنے چیخ چیخ کے گھر سر پہ اٹھا لیا۔ مردوئے کی مت اوندھی ہو گئی ہے۔ اے نہوتی میں کیا بیاہ شادیاں نہیں ہوتیں۔ اے ہے کیسی پٹکی پڑ گئی میری یاد پر اے بیگم کچھ اور بھی سنا وہ جو کمپنی باغ میں چاندنی چوک کے رخ گھنٹہ گھر کے سامنے ملکہ ٹوریا کا بت ہے نا، ستیا ناس پیٹارات کو کسی نے وس کی ناک کاٹ کر گلے میں جوتیوں کا ہار ڈال دیا لنگڑا کو تو وال اور کنستری بھی دیکھنے آیا تھا۔ غرض بی مہترانی سارا کام تو کمیریوں سے کراتی تھیں اور خود بیگم کو شہر کی ساری خبریں سنا جاتی تھیں۔

اب جس طرح خدار کھے لوگ بائیسکوپ جا کر دل بہلاتے ہیں یا مو ایلیویشن دیکھے ہیں پرانی دلی والے اسی طرح بھانڈوں اور طوائفوں کے ناچ دیکھتے تھے۔ دلی کی داستان کے ساتھ موتی بھانڈ کا نام شاید آپ نے بھی سنا ہو۔ اس پرناچنے کا فن ختم تھا۔ گانے بجانے کے سلسلے میں دلی کی ڈیرہ دار طوائفوں کا مختصر سا ذکر کرنا بے جا نہ ہو گا۔ نئی تانتی تو ان طوائفوں کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ڈیرے دار نیاں پیشہ نہیں کھاتی تھیں اور نہ عام طوائفوں کی طرح مجرے کرتی تھیں۔ ان کے ٹھکانے دراصل تہذیبی ادارے ہوتے تھے جن میں تمیز، اخلاق، اور شائستگی سکھائی جاتی تھی۔ ہر کس و ناکس ان کے ہاں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ دوانی جان اور چوٹی جان کے بارے میں سنا ہے کہ بارہ گھوڑوں کی بگھی میں سیر کو نکلا کرتی تھیں۔ کسی چھوٹی موٹی ریاست کا والی تو ان کے اصطبل کا خرچہ نہ اٹھا سکتا تھا۔ مرزا چپاتی نے اللہ بخشے انہیں کے لئے یہ شعر کہا تھا۔

گھستے گھستے ہو گئی اتنی ملت

سات پیسے کی دوائی رہ گئی

جزیرے اور کنجوس آدمی کو دلی والے منحوس سمجھتے تھے اور اس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہ تھے جو کبھی صبح ہی صبح کسی ایسے کی شکل اتفاقاً دکھائی دے جاتی تو کہتے خدا خیر کرے دیکھئے آج کیا افتاد پڑتی ہے۔ سنا ہے کہ بادشاہ کے زمانے میں ایک ایسا ہی منحوس شہر میں رہتا تھا۔ شدہ شدہ بادشاہ تک اس کی شکایتیں پہنچیں۔ بادشاہ نے کہا ”نہیں جی کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے بھلا ہم بھی تو دیکھیں“ چنانچہ ایک دن صبح کو بادشاہ برآمد ہونے تو لگانے والوں نے اس شخص کو بادشاہ کی نظر سے گزار دیا اللہ کی شان اس دن دو مقدمے آکر ایسے اڑے کہ دن کا تیسرا پہر ہو گیا اور خاصا تناول فرمانے کا وقت نکل گیا۔ بادشاہ سلامت کو جب بتایا گیا تو انھوں نے فرمایا ”اماں ہاں یہ شخص تو واقعی منحوس ہے پیش کرو اسے ہمارے حضور میں“ حکم کی دیر تھی اس غریب کو عصا برداروں نے پکڑا اور کشاں کشاں لے آئے۔ بادشاہ نے فرمایا ”اماں تم بڑے منحوس ہو جو تمہیں دیکھ لیتا ہے اسے روٹی نہیں ملتی۔ لہذا تمہیں موت کی سزا دی جاتی ہے۔ آدمی حاضر جواب تھا بولا ”حضور والا میں تو اتنا منحوس ہوں کہ مجھے جو دیکھ لیتا ہے اسے روٹی نہیں ملتی مگر میں نے آج حضور کے دیدار کئے تو اپنی جان ہی سے چلا۔ بادشاہ ہنس پڑے اور اس کی جان بخشی فرمائی۔

دلی میں موٹر گاڑیاں تو اب سے کوئی پچاس برس پہلے آئی ہیں ورنہ یہاں لمبے سفر کے لئے تانگے کی سواری کی جاتی تھی۔ پاکستان سے ملا واحدی دلی تشریف لائے تو انھوں نے تانگے میں بیٹھنے کی فرمائش کی۔ ان دنوں لوگ اکثر موٹروں میں سفر کرنے لگے تھے تانگے کا رواج تو بس برائے نام تھا۔ پھر حوتانگے والے تھے وہ بڑے اوجڑ تھے، شریف آدمی ان کے ساتھ بیٹھتا تو وہی حال ہوتا جو میر کا جاٹ

کے ساتھ ہوا تھا۔ خیر صاحب یا لوگ انہیں لے کر جامع مسجد آگئے دو چار تانگے والے بھی وہاں کھڑے تھے۔ ایک بڑے میاں سے پوچھا بھائی قطب چلو گے "انھوں نے جواب دیا ضرور چلوں گا روپے پچیس لگیں گے" واحدی صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا "میاں ہم گھوڑا تانگہ واپس کر دیں گے صرف سواری کے پیسے بتاؤ" بڑے میاں پھڑک گئے تانگے سے نیچے اتر واحدی صاحب سے بولے "آپ کوئی پرانے دلی والے ہیں آپ کو مفت سیر کراؤں گا۔ قسم خدا کی یہ فقرہ برسوں بعد کسی کے منہ سے سنا ہے۔ اب جو گھوڑے کوچکار کے ذرا ہشکارا دیا تو وہ یوں دلکی چلنے لگا جسے چاندی کے ورق کٹ رہے ہوں۔ گھوڑا ماشاء اللہ خوب تیار تھا ایسا کہ مکھی بیٹھے تو پھسل جائے ذرا سی ڈھیل چھوڑی تو ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

چوہا بل میں سماتا نہیں اور دم سے باندھ لی چھاج! دلی کے غریبوں کے ہاں خواہ آدمیوں کے رہنے کی جگہ نہ ہو جانور ضرور پلے ہوتے تھے۔ ہر گھر میں کبوتروں کے دس پانچ جوڑے رکھنا تو عام بات تھی۔ بعض لوگ تو انہیں سیّد سمجھتے تھے یہ بھی کہا جاتا تھا کہ جس گھر میں کبوتر ہوتے ہیں وہاں بیماری نہیں آتی کبوتروں کے شوق میں کبوتر بازوں نے نئی نسلیں تیار کر لی تھیں۔ چوک کی سیڑھیوں پر بائیں طرف ہر قسم کے کبوتروں کے ڈھیر کھانچے اور پنجر بھرے رہتے تھے، لال بند، جنگلی، سفیدے، پلکے، نفتے، کھرے، ویٹر، مکھی، لقا، یاہو، لوٹن، چوتے چندن اور نہ جانے کتنی قسم کے کبوتر ہوتے تھے۔ اسی چوک کی سیڑھیوں کے حوالے سے ایک بزرگ بڑا دلچسپ لطیفہ سناتے تھے۔ آپ بھی سن لیجئے اور دیکھئے کہ دلی میں گئے گزرے لوگ بھی کیسی فکر انگیز باتیں کیا کرتے تھے۔

کسی چڑی مار کی بیٹی جوان ہوئی تو اس کی گھر والی نے کہا "اب چڑیاں پکڑنے سے کام نہیں چلے گا کوئی بڑا پرندہ لاؤ تاکہ لڑکی کی شادی کے لئے کچھ پس انداز کیا

جاسکے۔ چڑی مار گئے اور ایک گدھ پکڑ لائے، شام کو چوک پر اسے پھٹکی سے باندھ کر بیٹھے تو ایک بھیڑ لگ گئی جو تھکدیکھنے چلا آتا تھا مگر نہ کسی نے دام پوچھے اور نہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا تین دن چڑی مار کو خالی ہاتھ گھر لوٹتے گزر گئے جب چوتھا دن آیا اور کوئی اس گدھ کا خریدار نہیں ہوا تو بڑے میاں نے اٹھا اس کی ٹانگیں چیر دیں کہنے لگے بڑے کی یوں توں میاں اس سے تو چھوٹے اچھے تھے کہ چار پیسے کی مزدوری تو ہو جاتی تھی۔ اب لوگ اس فسانے کو سنا کر آج کل والوں کے ہاتھوں جو بڑوں کی درگت بنتی ہے اس کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ پہلے زمانے میں تو بڑوں کا مان رکھا جاتا تھا۔ جو ہاتھوں نے کہہ دیا پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ چھوٹوں کی مجال نہیں تھی کہ بڑوں کے آگے بولیں۔ کبوتروں کے علاوہ طوطے، مینا، اگن، چندول، تیزا، بٹیر اور عل و پڈریاں بھی پنجروں میں پالے جاتے تھے۔

چوپایوں میں بھیڑے اور دنبے پالنے کا رواج تھا۔ لوگ باگ دودھ پیتا، بچہ لے کر پالتے، نہلاتے دھلاتے، مہندی لگاتے، دودھ جلیباں کھلا کر فرہ کرتے اور روز گھاس میں ٹھلانے لے جاتے تھے۔ دنبوں کی چکتیاں اتنی بڑی ہو جاتی تھیں کہ انہیں چھوٹی سی دوپھیوں کی گاڑی پر رکھا جاتا تھا دلی کے مہتر مینڈھے پالتے تھے اور انہیں ایسا تیار کرتے تھے کہ یہ دو دو آدمیوں کے بس میں نہ آتے تھے۔ گلے کے پٹے میں دو طرفہ باگ ڈوڑ لگائی جاتی تھی یہ جانور لڑانے کے لئے ہوتے تھے۔ بڑی بڑی شرطیں بدی جاتیں اور جب یہ آپس میں ٹکراتے تو دیکھنے والوں کا کلیجہ لرزتا تھا۔

متمدن شہروں کی عام کمزوری یہ ہے کہ وہاں کے لوگ فطرت اور اس کی بوقلمونی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں رکھتے۔ دلی اس کلیے سے مستثنیٰ ہے۔ دلی والوں نے آریہ ورت کے کاشتکاری کردار کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ یہاں کے موسموں میں

بھی اعتدال کے بجائے شدت پائی جاتی ہے۔ گرمی پڑتی ہے تو ایسی کہ خلق تراہ تراہ پکارتی ہے۔ جاڑے کا یہ عالم کہ اچھا خاصا انسان سردی کا موسم میں بنولا بن جاتا ہے اور برسات میں جب جھڑی لگتی ہے تو ہر سمت جل نفل دکھائی دیتے ہیں۔ ان شدید موسموں سے لطف اندوز ہونا اور ایک ایک رُت کا بھرپور مزالینا دلی کے خوش مزاجوں ہی کا کام ہے۔

گرمی کے موسم میں دلی والوں کا ایڑی سے چوٹی تک پسینہ بہتا ہے جھلستا ہوا سورج اور بھلستی ہوئی زمین کے درمیان لوگ کباب کی سیخ کی طرح گھڑی گھڑی پہلو بدلتے ہیں۔ پھلرے لال کمہلائے جاتے ہیں اور گلاب سے گال مرجھائے جاتے ہیں، وہ شددت ہوتی ہے کہ بھاڑ بھنتا رہتا ہے۔ مٹر کے دانے زمین پر پھینکے تو بھن کر چٹخنے لگیں۔ رات کو جس ایسا ہوتا ہے کہ دم گھٹا جاتا ہے اس پر بھی دلی والے کسی نہ کسی طرح دل بہلانے کے ڈھنگ ایجاد کر لیتے تھے، دن کو چھوٹے اور خس کی ٹٹیاں لگائی جاتی تھیں ان پر پانی کے ترپڑے پڑتے تھے۔ ہزارے چھوڑے جاتے تھے۔ ہزاروں کے منہ پر پودینے کی کھٹیاں بندھی ہوئی تھیں پانی میں گلاب ملا یا جاتا تھا۔ پرانی حویلیوں میں تنہ خانے تھے جب سورج اونچا ہو جاتا تو گھر والے تنہ خانے میں اتر جاتے تھے۔ شام کے لگ بھگ ان تنہ خانوں سے نکلتے، نہاتے دھوتے، جوڑے بدلتے، شربت پیتے، پان کی گلوری منہ میں دباتے اور سمیر کرنے نکل جاتے تھے۔ جن کے پاس ریڑھیاں اور تانگے تھے وہ ان میں ہوا کھاتے جن کے پاس اپنی سواری نہ تھی وہ بیگم کے باغ، اور فیروز شاہ کوٹلے میں جا بیٹھتے تھے۔ آج کل خس خانوں کی جگہ بجلی کے کولروں نے لی ہے مگر ان میں وہ بات کہاں جو ہزاروں اور خس کی ٹٹیوں میں تھی۔ کولر کی ہوا سے تو دن بدن لوگوں کو جسم کے درد

اور نزلے کی شکایت پیدا ہو رہی ہے۔ پرانے دلی والوں کی ایجادات کا ہنر یہ تھا کہ ان میں کوئی صورت خرابی کی نہ تھی گرمی کا دف مارتا، دماغ کو فرحت نصیب ہوتی اور آدمی کی جو نچالی میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔

ساون میں بارش کو ذرا دیر ہو جاتی تو بچے منہ پر سیاہی مل کر ٹولیاں بنا بنا کے پھرنے لگتے تھے۔ "کالے ڈنڈے پیلے ڈنڈے، برسے گا برسائے گا" لمبے لمبے کرتے پہنے فقروں کی ٹولیاں محلے محلے گھومنے لگتی تھیں اللہ کے نام کا بھنڈا راہوگا۔ پھر ان میں سے ایک صاحب جو اس ٹولی کے سربراہ ہوتے تھے چند خود ساختہ ناموزوں اشعار پڑھتے وہ رکتے تو سب کے سب مل کر ٹیپ کا مصرعہ "اللہ کے نام کا بھنڈا راہوگا" بلند آواز سے اٹھاتے تھے۔ لوگ حسبِ توفیق انہیں دان دیتے تھے۔ خدا جانے یہ بھنڈا را کب اور کہاں ہوتا تھا۔ ہوتا بھی تھا یا نہیں مگر دینے والوں کی نیتیں ٹھیک تھیں۔ گھی کہاں گیا کچڑی میں کچڑی کہاں گئی پیاروں کے پیٹ میں۔ اللہ کی شان ان ٹوٹکوں سے بارش بھی ہو جاتی تھی۔ کڑک اور گرج کی آوازیں سن کر لوگ اندر دالان میں آ بیٹھتے تھے۔ آسمان پر سہاگنی گھٹائیں جھوم جھوم کر آتی تھیں اب جو دھونٹال مینہ پڑتا تھا تو گرمی کے سارے دلدر دھل جاتے تھے ایسے میں لڑکیاں بالیاں کاہے کو بچی بیٹھتیں بارش میں باہر تو نکل نہیں سکتی تھیں۔ پیش دالان کی چھت میں دو قدابوں کے درمیان بیلن پڑا ہوتا تھا اس میں دوہرا جھولا فوراً ڈال لیا جاتا تھا گنگا جمنی رسیاں اور لال سبز پٹریاں۔ دولڑکیاں آمنے سامنے پیر جوڑ کر جھولوں میں بیٹھ گئیں اور دو چھلانے لگیں "جھولا کن ڈارو رہے امریاں" جھولے کا یہ گیت سنا ہے دلی کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا لکھا ہوا ہے۔ مینہ کا زور کم ہوا اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی تو گرمی سے جھلسے ہوئے بچے انگنائی میں جا بیٹھے

پھوار میں بھیگنے سے بدن کی گرمی چھٹتی ہے۔ گرمی دانے مرتے ہیں اور طبیعت پر جولانی طاری ہوتی ہے۔

جاڑے کا موسم آتا تو اس کی آمد سے پہلے ساری نیاریاں کر لی جاتی تھیں۔ گرنٹ کے لحاف۔ پوت کی رنگا رنگ رضائیاں بنائی جاتی تھیں۔ نین چار مہینے کا ایندھن بخاریوں میں بھر لیا جاتا تھا کھانے پینے کی چیزیں اور میوے جمع کر لئے جاتے تھے۔ سردی شروع ہوتے ہی لوگ مرغن غذائیں کھانے لگتے تھے۔ دن بھر دھوپ میں بیٹھے سنا کرنے اور سر شام ہی رضائیوں میں دبک جاتے تھے۔ روئی بھرے کپڑے پہننے کا بھی رواج تھا۔ بڑے بوڑھے بچے بھی ہلکی سی روئی کی تہہ لگے پہنا کرتے تھے۔ عورتیں کشمیری شال اور دوشالے اوڑھتی تھیں۔ جن میں انہیں خریدنے کی استطاعت نہیں تھی وہ دلائیاں بنا لیتی تھیں رات کو اول وقت سے لوگ کام کاج چھوڑ کر ایک گمت بیٹھ جاتے تھے کوئی بڑی بوڑھی قصہ کہانی چھیڑ دیتی۔ جب رات بھیگنے لگتی تو سب سو جاتے تھے۔ عام طور سے زمین پر سویا جاتا تھا چھوٹے بچے آپس میں گڈمڈ ہوئے پڑے رہتے تھے۔ صبح اٹھتے تو صحن میں ژالہ باری کی ننھی ننھی بوندیں دیکھ کر خوش ہوتے تھے کبھی کبھی تو مٹکوں کا پانی تک جم جاتا تھا۔ غرض یہ کہ ہر موسم کا اپنا ایک الگ لطف تھا۔ آج کل دلی والوں کو یہ مزے کہاں حاصل ہیں زرا گرمی پڑی پنکھے اور کولر کھل گئے برسات میں آخر جابیں کہاں باغ بغیچہ ختم ہوئے پھر دلوں پر مردنی چھا گئی ہے۔ جاڑے کا موسم ہیٹر کی نذر ہوا۔ کھانے پینے کی نعمتوں کی ہنگامی اور بے ایمانی نے صفایا کر دیا۔ وہ جو کہتے ہیں کہ نیت گیل برکت ہوتی ہے سو نیتیں خراب ہوئیں تو دنیا کے مزے ناپید ہو گئے اب تو ہر موسم طبعتوں کو ناگوار کرتا ہے آدمی لطف اٹھانا تو سبھوں گیا فقط کڑ کڑ کئے جانا

ہے بھلا دیکھئے تو سہی کیسی ناشکری کا دور ہے

دلی کے حکیموں کا ذکر نہیں کیا تو وہ ناراض ہو جائیں گے۔ حکیم جمیل کے ہاتھ سے ہندوستانی دواخانے کا انتظام چھنا تھا تو انہوں نے شریف منزل میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی۔ والدہ کا انتقال ہوا تو بھی دروازے تک کندھا دینے آئے آخر بدل ہو کر وطن مالموف سے کوچ کیا۔ دیارِ غیر میں گمنامی کی زندگی گزارنے پر آمادہ ہو گئے۔ اللہ اللہ یا تو دلی والوں سے دلی کی گلیاں چھوٹی نہ تھیں یا وہ انقلاب آئے کہ جان و تن میں جدائی ہو گئی۔ حکیموں کے دلی پر بہت احسانات ہیں۔ مدت پہلے جب نزلے بخار کی وبا پھیلی تھی تو حکیم اجمل خاں نے چوراہوں پر جو شاندرے کے پتیلے چڑھوا دیئے تھے۔ مفت علاج کیا جاتا تھا۔ یا تو منٹ منٹ پر لہلہاتی لاشیں جارہی تھیں یا اللہ کے حکم سے خیر و عافیت ہو گئی۔ اس خاندان کے ہاتھ میں شفا تھی۔ نباض ایسے ایسے گزرے ہیں کہ سنا ہے کہ کسی من چلے نے آزمائش کے لئے بھینس کی ٹانگ میں دھاگا باندھ پردے کے پیچھے سے اس کا دوسرا سرا انہیں تھما دیا حکیم صاحب نے بھوسی ٹکڑے، کھل، بنولے کا نسخہ لکھ دیا۔ بڑے بڑے راجہ نوابوں نے ان کے بل پر عیش و عشرت کی زندگی گزار لی، سینکڑوں عورتوں کے حرم رکھے لاکھوں کے نذرانے پیش کئے اور اراضی خدمت میں پیش کی۔ غریبوں کا علاج البتہ مفت کیا جاتا تھا۔ بٹوارے سے پہلے تک بیماروں میں ان حکیموں کے دروازوں پر خلقت کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ حکیم محمد احمد خاں کو مطلب سے لے کر جب ایک مریض چلتا تو پیچھے ضرورت مندوں کی بھیڑ ہوتی تھی۔ موٹر میں قطار در قطار چلا کرتی تھیں۔ انہوں نے خاک بھی پڑیا میں باندھ کر دیدی تو اللہ تعالیٰ شفاء عطا کرتا تھا۔ یہ ادارہ آزادی کے بعد تک حکیم

عاقل خاں اور حکیم عبدالرحیم کی زندگی میں بھی قائم رہا اب یہ لوگ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

دلی کی تعمیر کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔ ناصر نذیر فراق نے لکھا ہے کہ جب لال قلعہ اور جامع مسجد بن کر تیار ہو گئے تو شاہجہاں نے حکم دیا کہ امرا اور روسا کی حویلیاں شہر کے بیچوں بیچ اور کاریگروں و صنعت کاروں کے کوچے کنارے کنارے بسائے جائیں۔ دلی گیٹ سے جٹواڑے، قصاب پورے گھونسیوں کے محلے، کھٹیکوں کی بستی، کوندے والاں، نیاریاں، رودگران، چابک سواران اور فراش خانے سے گزر کر آپ مسجد فتحپوری پہنچ جائیں گے۔ چاندنی چوک میں جو گلیاں اور کوچے ہیں وہ نوابین، جوہریوں اور روسا سے آباد تھے۔ جامع مسجد کے قریب کوچہ چیلان میں علما اور صلحا رہتے تھے بنگش کا کمرہ، صدر الصدور کی حویلی، نواب دوجانہ کا مکان، نواب عزیز آبادی کا بھاٹک، شبیش محل، چاندی محل سب اسی قرب و جوار میں واقع ہیں۔ سینتارام بازار اور بلبلی خانے میں بھی کئی امیروں کی بارگاہیں تھیں۔ اب نہ وہ امیر رہے نہ ان کے مکانات فقط نشان باقی ہیں جو اگلے وقتوں کا فسانہ زبان حال سے سنار ہے ہیں۔ جب حویلیاں نہ رہیں تو یہ نشان بھی کب تک باقی رہیں گے۔ ابھی کچھ دن پہلے بُل ڈوزر چلے تھے تو دلی والوں نے اُس چھوڑی تھی ایسا لگتا تھا کہ سارا شہر ایک لمبے چوڑے صحرا میں بدل جائے گا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے چند حیا لوں کا۔ جان پر کھیل کر دلی کو بچا لیا۔ مگر یہ بھی آخر کب تک پچائیں گے جس شہر میں ہزاروں کی گنجائش ہے وہاں لاکھوں بسے ہوئے ہیں۔ روز صبح سے شام تک آنے والوں کی بھرمار رہتی ہے۔ آدمی کیڑے مکوڑوں کی طرح رہینگے دکھائی دیتے ہیں۔ بازاروں میں چلنا

مشکل ہو گیا ہے۔ گلیاں بازار جو کبھی مصطور اور اوراق تھے، اللہ معاف کرے
ڈلاؤ کی صورت ہو گئے ہیں۔ دہلی کے پرانے مکین دیکھ دیکھ کر ہولتے رہتے
ہیں مگر جس طرح بنتی میں ہر شے ساتھ دیتی ہے اسی طرح بگڑتی میں زمین
آسمان دشمن ہو جاتے ہیں۔ کوئی کتنا ہی زور لگالے جو ہونا ہے وہ ہو کر رہتا
ہے خدا اس شہر کے اگلے دن لوٹا دے دہلی والوں کی یا چھپیں کھل جائیں گی۔

غدر کے زمانے میں ایک فقیر دہلی کے گلی کوچوں میں لہک لہک کر صدا
لگاتے تھے۔ سات دہلی، آٹھ بادی قلعہ وزیر آباد اس زمانے میں تو لوگ
اس صدا کو محذوب کی بڑ سمجھتے ہوں گے لیکن آج معلوم ہوا کہ جب سات
دہلیاں بس کر اجر گئیں تو آبادی کا پھیلاؤ بادی کی طرف بڑھا اور اس سے
آگے وہ زمانہ آیا جب وزیر آباد کے قلعے تک دہلی کی حدود پھیلتی چلی گئیں۔ اب
تو خدا رکھے یہ عالم ہے کہ دہلی، بوپی اور ہریانہ سب ایک ہو گئے ہیں۔ اگلے دس
برس میں لوگوں کا اندازہ ہے دہلی چالیس پچاس میل تک اور پھیل جائے گی۔
لو بھائی آج تک تو دہلی کی ایک ہی سوت یعنی نئی دہلی تھی اب اور کئی پیدا ہوں گی۔
ہم دہلی والے حسد کی آگ میں تو جلتے نہیں اللہ انہیں بھی پنپنا مبارک کرے
ہاں یہ دعا ضرور کرتے ہیں کہ دہلی کا سہاگ برقرار رہے۔ اس کی قسمت کا پھیر
نکل جائے اور اس کی اگلے دنوں کی رونقیں دوبارہ لوٹ آئیں۔ دہلی کیا تھی، کبھی
تھی، کیوں مشہور ہے، یہ تو آپ کو اسی وقت اندازہ ہو گا جب دہلی والوں کی
اقدار اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے۔ سچ ہے شنیدہ کہ بودمانند دیدہ۔ ابھی تو یہ ساری
داستان الف لیلیٰ کا ایک رنگیں باپ نظر آتی ہے۔ خدا را غور سے سن تو لیجئے کل سنانے
والوں کا بھی توڑا ہو جائے گا۔

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنئے گا۔ پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تک سردھنئے گا

سید ضمیر حسن دہلوی

